پرانے ماں باپ اور نئے اولڈ ہاؤس

تحریر: سہیل احمد لون

تقریباً ڈیڑھ دہائی قبل جرمنی کے ایک مقامی اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے میری نظر ایک اشتہار پر رک گئی۔ متن پڑھ کر بڑا تجسس ہوا۔ پھر دیئے گئے ٹیلیفون نمبر کو ڈائل کیا اور ملاقات کا وقت لے کر میں نے ایک گھر کے دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجائی۔ دروازے پر نصب سپیکر فون پر میں نے اپنا نام بتایا تو دروازہ کھول دیا گیا۔ ساتھ ہی مجھ کو بتایا گیا کہ میں مجھے پہلی منزل پر پہنچانا ہوگا۔ ایک بزرگ خاتون نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھول کر میرا پرتپاک استقبال کرتے ہوئے اندر آنے کی دعوت دی اور ہم ڈرائنگ روم کے وسط میں صوفے پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ جہاں میز پر پانی اور جوس وغیرہ پہلے سے موجود تھا۔ انہوں نے اپنا نام Fuchs (فوکس) اور عمر 76 سال بتائی۔ معلوم پڑا کہ وہ ریٹائرڈ ٹیچر اور سوشل ورکر تھیں۔ خاوند فوت ہو چکا تھا اور بچے اپنے اپنے گھروں رہتے ہیں۔ جس فلیٹ میں وہ رہائش پزیر تھیں وہ اُن کی ذاتی ملکیت تھا۔ اُن کی بچے سال میں ایک دوبار آ کر مل جاتے تھے۔ تا کہ کسی ہنگامی صورت میں ترکے کا بٹوارہ فوری ہو سکے۔ اماں جی کا اپنے نواسے, نواسی, اور پوتے سے پیار کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے گھر لاتعداد تحائف رکھے ہوتے تھے تا کہ وہ جب کبھی بھی ملنے آئیں تو خالی ہاتھ نہ جائیں۔ وہ تنہائی کا شکار ہو چکی تھیں اور اسی مقصد کے لیے انہوں نے اخبار میں اشتہار دیا تھا کہ "انتہائی آسان پارٹ ٹائم جاب" یعنی ہفتے میں 3 بار 2,2 گھنٹے کے لیے اُن کے گھر جا کر اُن سے باتیں کرنا۔ تنخواہ کے علاوہ چائے, کافی اور مشروبات سے تواضع بھی پیکج میں شامل تھا.....! میں نے انہیں بتایا کہ میں چونکہ دوسرے شہر میں رہتا ہوں اس کام کے لیے کوئی مقامی زیادہ موزوں ہو گا۔ میں نے اُن سے فون پر بات چیت کرتے رہنے کا وعدہ ضرور کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس سے پہلے بھی ایک ایشین اس کام کے لیے آتا تھا۔ جو اب کسی دوسرے شہر میں کام ملنے کی وجہ سے شفٹ ہو گیا ہے۔ Fuchs (فوکس) نے اُس ایشین کی بڑی تعریف کی اور بتایا کہ وہ پاکستانی تھا۔ جو اُن کی عزت اور احترام اُن کے اپنے بچوں سے زیادہ کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ ہمارے لوگوں سے بہت متاثر تھیں کہ ہم لوگ رشتوں کی قدر کرتے ہیں۔ ہماری سماجی قدروں میں اُن کو سب سے زیادہ ہمارا مضبوط فیملی سسٹم پسند تھا۔ جس میں فیملی کے بزرگ تو درکنار گھر سے باہر, محلے, گلیوں اور بازاروں میں بھی ان کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے۔ جہاں ہر کوئی ان کو پیار اور عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ گھر میں بزرگوں کا وجود باعث برکت سمجھا جاتا ہے۔ یورپی معاشرے کے بہت سے اچھے پہلو ہیں مگر یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اکثر بزرگ اپنی اولاد کی آواز سننے اور اور ان کا چہرہ دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔ تنہائی کا ناگ جب ڈستا ہے تو کسی غیر کی صحبت چاہے وہ معاوضہ دے کر ہی کیوں نہ حاصل کرنے پڑے "تریاق" کا کام کرتی ہے۔ میں اُن سے مل کر آ گیا اور اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت تصور کیا کہ میں نے اس معاشرے میں جنم لیا جہاں بزرگوں کے فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا رواج تھا, زندگی کے اہم فیصلوں میں ان کی رائے اور مشورے کو سب سے زیادہ اہمیت اور برکت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ بغیر کسی طمع کے ان کو بوجھ سمجھنے کی بجائے ان کی خدمت کرنا

باعث مسرت تصور کیا جاتا تھا۔اپنی نسلوں کوان کی شفقت سے فیض یاب کرانا بڑی قسمت کی بات مانا جاتا تھا۔مگر جنرل ضیاءالحق نے جہاں ہماری سماجی قدروں کو بدلنے کیلئے ایک مخصوص مذہبی فکر متعارف کروائی وہاں اُس نے ہر شے کو بکنے والی چیز بنا کر مادیت کے سمندر کے اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک قلیل وقت نے ہمارے صدیوں پرانے مضبوط ڈھانچے کو جڑ سے ہلا کر رکھ دیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی تند و تیز بے لگام طوفان نے سب کچھ الٹ پلٹ کار کھ دیا ہے۔بدقسمتی سے ہم دوسرے معاشروں سے وہ چیزیں اپنا رہے ہیں جو یقیناً نئی تو ہیں لیکن ہمارے معروض میں اُن کیلئے گنجائش نہیں پائی جاتی۔دوسروں کی بری رسموں اور عادات کو برق رفتاری سے اپنائے جا رہے ہیں اور اپنی اچھائیوں کو جو کبھی ہمارا طرہ امتیاز اور ہمارا خاصا تھیں یوں چھوڑتے جا رہے ہیں جیسے کسی چور کو یک لخت ولائیت مل جائے تو وہ چوری چھوڑ دے۔اگر تقلید کرنی ہی ہے تو مغربی معاشرے کے بہت سے روشن پہلو بھی ہیں۔جن کو اپنا کر ہم اپنے معاشرہ مزید سنوار سکتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کی شادیوں کے کامیاب ہونے کا راز "برداشت " اور "اطاعت " میں پنہاں تھا۔جواب جنسِ نایاب ہو چکی ہیں۔جس کی وجہ سے طلاق کی شرح میں مہنگائی اور بے روزگاری کی طرح اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔اس ناپسندیدہ حلال فعل میں اکثر قربانی کے بکرے معصوم بچے ہی بنتے ہیں جو عمر بھر ماں باپ کو اکٹھے دیکھنے کی خواہش میں زندگی بسر کر دیتے ہیں۔طلاق کی یہ روایت بھی مغربی تقلید کا ایک پہلو ہے۔مغربی معاشرے میں عورتوں اور مردوں کے حقوق و فرائض میں توازن نہیں ہوتا۔حقوق کے پلڑے میں عورتوں کی قسمت اور فرائض کے پلڑے میں مردوں کا مقدر سجایا جاتا ہے۔ جو شادیوں کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ بنتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں کبھی شادی کا بندھن مرتے دم تک ہر حال میں نبھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ہم اگر اپنے بزرگوں کو دیکھیں تو ان کی جوڑی کی رفاقت دیکھ کر واقعتاً یقین ہو جاتا ہے کہ جوڑے کبھی آسمان پر ہی بنتے ہوں گے لیکن مغربی معاشرہ اس حوالے سے بالکل مختلف ہے جہاں ایک جوڑے کے آسمان پر دس دس جوڑے بنے دکھائی دیتے ہیں۔ جب سے ہم مغرب زدہ ہونا شروع ہوئے ہیں درحقیقت آفت زدہ ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

مغرب اور مشرق کی تہذیب میں سب سے بڑا فرق ہی مضبوط فیملی سسٹم کا تھا۔جو ہمارے ہاں گھر کے سربراہ سے شروع ہو کر گلی محلّہ کے بزرگوں سے ہوتا ہوا علاقے کے بزرگوں کی پنچائیت تک جا پہنچتا تھا اور تمام ثالثی فیصلے خوش اسلوبی سے حل کر لیے جاتے تھے۔ ہمارے معاشرے میں کبھی بزرگوں کو گھر سے نکال کر علیحدہ یا اکیلا رکھنے کا تصور خدا کے حضور گناہ اور سماجی طور پر بدترین بدنامی کی وجہ بن جاتا تھا۔مگر آج مغربی لعنت "اولڈ ہاؤس" دوسری لاتعداد لعنتوں کی طرح ہمارے معاشرے میں بھی نظر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ہمارے بزرگوں کی اکثریت کے پاس تو اتنے وسائل بھی نہیں کہ وہ میڈم Fuchs (فوکس) کی طرح معاوضہ دے کر کسی کو گھر بلا کر زخمِ تنہائی پر خریدی ہوئی باتوں کا مرہم ہی رکھ سکیں۔حالات ایسے ہیں کہ اگر کوئی صاحب حیثیت تنہائی کا ستایا ہوا بزرگ اخبار میں ایسا اشتہار دینے کی جرات کرے تو اسکو اُس کی تنہائی سمیت ہمیشہ کے لیے ختم کرنے والوں کا تانتا بندھ جائے۔اپنے بزرگوں سے ناروا سلوک کرنے والوں کو یہ بات ہمیشہ مدنظر رکھنی چاہئے کہ وہ بھی آنے والے کل کے بزرگ ہیں، کمزور اور ناتواں۔ وہ یہ کام جن کا روشن مستقبل کیلئے سرانجام دے رہے ہیں وہ بھی سب کچھ کن اکھیوں سے دیکھ رہے ہیں اور آنے والے دنوں میں وہی ان کو تنہائی کی تاریکی میں ڈبوئیں گے جہاں ان کی آہ و بقاء سننے

والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ بزرگوں کو صرف ''اے ٹی ایم مشین'' ہی نہیں سمجھنا چاہیے کہ جس سے اگر پیسہ آنا بند ہو جائیں تو.....!!! آج ہمارے ملک میں بھی فادر ڈے اور مدر ڈے منایا جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے معاشرے میں تو ہر دن اور رات والدین کا ہی ہوتا تھا۔ ہمیں تخلیق کرنے میں خالق کائنات نے ماں باپ کو وسیلہ بنایا ہے۔ ماں تو وہ ہستی ہے جو اپنے بچے کو اس وقت سے پیار کرنا شروع کر دیتی ہے جب اسے پہلی بار بچے کے وجود کا احساس اپنے وجود میں محسوس ہوتا ہے۔ بچے کے دل کی دھڑکن سب سے پہلے ماں ہی محسوس کرتی ہے۔ پیدائش کے مراحل کی ساری تکالیف اپنے بچے کا پہلا دیدار کر کے بھول جاتی ہے۔ دنیا میں آنے سے پہلے اور کئی ماہ بعد تک بچہ اپنی ماں کے جسم سے خوراک حاصل کرتا ہے۔ باپ اپنا پیٹ کاٹ کر اپنی خواہشوں کا گلہ گھونٹ کر شب و روز محنت کر کے بچے کے ناز نخرے اٹھاتا ہے۔ جب یہی ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو ان کی جگہ "اولڈ ہاؤس" نہیں بلکہ دلوں میں ہونی چاہیے۔ بزرگ اس شجر کی مانند ہوتے ہیں جو خود دھوپ کی گرمی برداشت کرتا ہے مگر دوسروں کو ٹھنڈا سایہ اور میٹھا پھل دیتا ہے۔ جس طرح ایک پتا شاخ سے گر کر اپنی جڑوں کی طرف آتا ہے اسی طرح ہم نے بھی اپنے اصل کو لوٹنا ہے۔ کئی دولتمند گھر میں جدت لانے کی غرض سے اپنے بزرگوں کو بھی پرانی چیز سمجھ کر گھر سے نکال دیتے ہیں۔ کچھ افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان کو اضافی بوجھ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ہر دو صورتوں میں یہ انتہائی شرمناک اور قابلِ نفرت فعل ہے مگر افسوس کہ ہم ریاکاری کے ابلیس یا بھوک کے خوف سے اس گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ جس کی تلافی ممکن نہیں۔ اس کا احساس تب ہوتا ہے جب وہ کبھی نہ ملنے کے لیے بچھڑ جائیں۔ اس وقت اپنی ہی لگائی ہوئی کسک کی آگ میں جلنا مقدر ہوگا۔ ہماری سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ ہمارے حصے میں اچھے لوگوں کی آخری نسل کی خدمت کرنے کا عظیم فریضہ آیا ہے کیونکہ اس کے بعد کی نسل ہم ہیں اور ہم اتنے تو ضرور جانتے ہیں کہ ہم کتنے اچھے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ اولڈ ہاؤس مغرب میں پرانے ماں باپ کیلئے ہوتے ہیں لیکن اپنے مذہب، کلچر، مٹی اور اخلاقیات میں واحد یہی تو ایک شے ہر جو ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ زیادہ قابلِ احترام اور قابلِ عزت ہو جاتے ہیں۔ بھلا ماں باپ بھی کبھی پرانے ہوتے ہیں؟

تحریر: سہیل احمد لون

سربٹن۔سرے